معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جنوری-جون ۲۰۰۹ء

ناصؔر کاظمی کی شاعری، کربِ ذات سے آگے

یاسمین سلطانہ*

قیام پاکستان نے برعظیم کے عوام کی زندگی کی بساط پلٹ کر رکھ دی۔ آزادی کے بعد سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تقاضے بدل چکے تھے۔ سامراجی قوت کا تسلط ختم ہونے کے بعد سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر نئے فیصلوں کا وقت تھا۔ شاعروں اور مصنفوں کے لیے مخصوص روش کو چھوڑ کر نئے فیصلوں کا وقت تھا۔ شاعروں اور مصنفوں کے لیے مخصوص روش کو چھوڑ کر نئے راستے اختیار کرنا مشکل مرحلہ تھا۔ قیام پاکستان کے پرآشوب دور نے ادب پر خاص اثرات مرتب کئے۔ آزادی سے پہلے نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا چرچا تھا۔ شاعروں نے تصوف، اوہام پرستی، مافوق الفطرت عناصر قوتوں پر یقین، رندی اور دیوانگی کے تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر کے کچھ نئے تصورات کو جنم دیا۔ وہ تصورات جن کا تعلق مادّی زندگی کی فلاح و بہبود اور زمانہ حاضر کے مسائل کا حل تلاش کرنے سے تھا۔ تقسیم ہند کے کچھ دنوں بعد تک ہمارے شعراء کے ہاں یہ تصورات یعنی جمہوریت، اشتراکیت، بغاوت اور انقلاب جیسے موضوعات موجود تھے۔ شاعر زندگی کی ان تلخیوں کو جھیل رہا تھا اس لیے شاعری میں ان کے بارے میں ردعمل کا اظہار کرتا تھا۔

بدلتے ہوئے وقت نے آزادی کے حصول کو ممکن بنایا لیکن اس تقسیم کے بعد جب خوابوں اور آدرشوں کا طلسم ٹوٹا تو شاعر حضرات اس احساس شکست سے خود کو بچا نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء ماضی قریب کے شعراء کی نسبت ماضی بعید کے شعراء کے قریب نظر آنے لگے۔ انھیں حالؔی کی اصلاحی شاعری، اقبالؔ کی ملّت پرستی، جوشؔ کا نعرہ انقلاب، سردار جعفری کی اشتراکیت خاص حد تک باسی اور پرانی لگنے لگی اور میرؔ کی دردمندی، غالبؔ کی تشکیک اور احساس شکست یگانہؔ اور فراقؔ کی نفسیاتی پیچیدگی کی کیفیت زیادہ نئی اور حقیقت سے قریب نظر آنے لگی۔ [۱]

تقسیم کے بعد اردو غزل میں کئی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں سب سے منفرد اور اپنا آپ منوانے والی آواز ناصؔر کاظمی کی تھی۔ ترقی پسند تحریک ہو یا حلقہ ارباب ذوق کی تحریک، سب کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ تقسیم کے تجربے کا انھوں نے اپنے اپنے نظریات کے تحت تجزیے کئے جبکہ ناصر کاظمی کے پاس کوئی نظریہ نہ تھا۔ ناصؔر اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اپنی اندرونی مضطرب شخصیت اور غزل کی ہیئت میں زبردست ہم آہنگی محسوس کی اور جو خارجی مسائل سمیت اپنے خیالات و تجربات کا بہتر اظہار غزل ہی میں کر سکتے تھے۔ شعراء کے اس گروہ نے جس میں ناصؔر کاظمی کے علاوہ منیؔر نیازی، عزیز حامؔد مدنی، ابن انشاؔء اور دوسرے شاعر شامل تھے، غزل کو محدود نظریے سے آزاد کیا اور اردو غزل میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ ناصؔر نے غزل کا پرچم اس وقت بلند کیا، جب کہ سارے برِعظیم میں اردو شاعری کا سب سے بڑا اظہار نظموں میں

* ماہرِ مضمون، محکمۂ تعلیمات، حکومتِ سندھ؛ رہائش: AA-۳۰۲، اربن پیراڈائز، بلاک ۲۱، فیڈرل بی ایریا، کراچی

ہو رہا تھا۔اس لحاظ سے انھیں باقی شاعروں کے برعکس روایت کا نقیب کہنا چاہیے۔ ۲ناصؔر کاظمی نے تحریک پاکستان میں گو اس طرح بھرپور حصّہ نہیں لیا جیسا کہ دوسرے نوجوان باقاعدہ تنظیموں میں شامل ہو کر لے رہے تھے مگر ان کے دل میں انگریزوں اور ہندو سامراج کے خلاف ایک نفرت بھری تھی جس کا اظہار کبھی دیوالی کے دیئے توڑ کر تو کبھی بم دھماکہ کرتے ہوئے کرتے۔ناصؔر ان باغیوں میں سے تھے جو غلامی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے تھے اور ظلم و استبداد کی طاقتوں کو ناکوں چنے چبوانے کے آرزومند تھے۔ ۳

کل یہ تاب و تواں نہ رہے گی ٹھنڈا ہو جائے گا لہو
نام خدا ہو جوان ابھی کچھ کر گزرو تو بہتر ہے ۴

آزادی کے سورج اور آزادی کے دن نے نفس اور وجود کو جس حدّت اور گرمی اور خاک و خون سے روشناس کیا تھا، اور روح میں جس پیاس اور شدّت کو اجاگر کیا تھا، ناصؔر کاظمی نے اپنی روح کی گہرائیوں میں اس عظیم عالم اضطراب کو پناہ دی۔لاہور نے ہجرت کے ہجوم اپنے اندر اتار لیے۔اپنی گلی کوچوں میں انھیں سمو لیا۔ناصؔر نے اپنے دل میں آرزوؤں اور حسرتوں کے قافلوں کو قیام کرنے کے لیے جگہ بخشی۔ ۵ اس نے ہجرت کو محض ذاتی تجربے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس فراواں مخلوق کے تجربے کی حیثیت سے محسوس کیا اور بیان کیا جو ہندوستان سے پاکستان کی طرف خاک و خون کی آگ اگلتی دریا سے گزر کر آئی تھی۔ان کے اشعار میں ہجرت کے اجتمائی تجربے، بے نشان قافلوں کے سفر اور عام تباہی اور ویرانی کی جتنی اثر انگیز تصویریں نظر آتی ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے ۶

گرجنے لگیں آگ کی بدلیاں
جھلسنے لگیں پیاس کی کھیتیاں ۷
زمیں بٹ گئی، آسماں بٹ گیا
چمن بٹ گیا، آشیاں بٹ گیا ۸

ہجرت کے وقت مہاجرین کی آنکھوں میں جو سپنے تھے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔اس کی کرچیوں کی چبھن ناصؔر کے اشعار میں تلخیاں بھرنے لگیں۔ یہ تقسیم صرف سرحدوں کی تقسیم نہ تھی، خطوں کا بٹوارہ نہ تھا بلکہ دلوں کی تقسیم تھی، وجود کا بٹوارہ تھا، روحوں کے ٹکڑے کئے گئے تھے۔مہاجروں کو کشت و خوں سے نجات ملی تو سب سے پہلا درد ان کے دلوں میں اپنوں کی جدائی کا اٹھا۔ناصؔر نے اس درد کو اپنے اندر جذب کر کے ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ان کی آواز لاکھوں ہجرت کرنے والوں کی آواز بن گئی۔

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر ۹

فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا ۱۰؎

رہ و رسم اجداد سے کٹ گئے
ہم اپنی روایات سے کٹ گئے ۱۱؎

شاعروں اور ادیبوں کے شہر، شہر دلّی پر بار بار قیامت ٹوٹتی رہی۔ دلّی اجڑنے کا یہ درد بزرگ شعراء کے یہاں سے ہوتا ہوا ناصرؔ تک آن پہنچا۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ ۱۲؎

جو شخص دلّی کے اجڑنے پر اتنا ملول نظر آ رہا تھا وہ اپنے شہر کے اجڑنے پر کیسے کیسے نہ تڑپا ہوگا۔ اس کا وہ شہر لٹ گیا جہاں اس نے آنکھ کھولی، بچپن لڑکپن کے دن گزارے، جہاں اس کے سنگی ساتھیوں کی یادیں بکھری تھیں۔ ناصرؔ اپنے شہر انبالہ کے لٹنے پر بڑے دل گرفتہ نظر آتے ہیں۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریہ کی روشنی ۱۳؎

ناصرؔ نے جب انبالہ سے لاہور ہجرت کی تو یہاں کی دنیا اسے انبالہ سے الگ لگی۔ دراصل ہجرت سے ایک تو موجود رشتوں سے دوری ہوتی ہے اور نئے انسانوں سے تعلق جڑتا ہے، دوسرے زمین سے اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا احساس ابھرتا ہے۔ ناصرؔ کے لئے یہ نقل مکانی ایک بھرپور تجربہ رہا۔ اس حوالے سے ان کی شاعری میں اداسی کی فضا، یادوں اور جدائی کے استعارے ایک کسک کے ساتھ ابھرتے ہیں۔

میں اس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا ۱۴؎

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا ۱۵؎

ناصرؔ بار بار ماضی کی طرف مراجعت کرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی میں پہنچتے ہی ناصرؔ کی یادوں کے گلاب کھل جاتے ہیں۔ وہ ان رونقوں کو، ان لوگوں کو یاد کرتے ہیں جن سے ان کے دل کے تار ملتے تھے۔

یاد آتی ہیں دور کی باتیں
پیار سے دیکھتا ہے، جب کوئی ۱۶؎

بچپن میں بھی وہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت

جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہرے بیر ۱۷

دل ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے ۱۸

ناصؔر بے شک ہجرت کے دکھ پر نوحہ خواں نظر آتا ہے لیکن ان نوحوں کے بعد وہ ایک عزم کے ساتھ زندگی کا دامن پکڑتے ہیں۔ نئی زمین اور نئے موسموں کے حوالے سے زندگی کی بات کرتے ہیں اور زندگی بسر کرنے کی راہ سمجھاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ہجرت کا درد تو نظر آتا ہے مگر مایوسی نہیں۔ وہ اردگرد کے مسائل سے نظر چرا کر کسی خواب میں پناہ نہیں لیتے بلکہ زندگی سے وابستہ حقائق کے ادراک کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر قبول کرتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی یہ احساس دلاتے ہیں کہ ماضی کی زندگی اپنے سارے حسن کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی ہے اور ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس خاکستر سے نئی زندگی پیدا کرنا پڑے گی۔ یوں ناصؔر شروع میں ہجرت کا المیہ اور اداسی اور آخر میں امید کی کرن دکھا کر زندگی کے دونوں رخوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پر آ گیا ۱۹

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی ۲۰

اندھیروں کی نگری میں پھوٹی کرن
مہکنے لگی خاک دان کہن ۲۱

جس ملک کے حصول کے لئے بزرگوں نے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا، اپنوں کی جدائی سہی تھی، بے سروسامانی کا عذاب جھیلا تھا، اس ملک کی فضا زہر آلود ہونے لگی، اس سرزمین سے وابستہ امیدیں دم توڑنے لگیں۔ سطحی ذہن کے سیاستدانوں کی بدولت اس ملک کا جو حشر ہوا اور اس کے شہروں میں جس قسم کے منتظم ذہن پیدا ہوئے، اس غیر حساس اور غیر رفیق ذہن کے سامنے شاعر کا جواب دہ ہونا ہولناک عذاب تھا۔ ۲۲

اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے ۲۳

نیا شور لے کر جمودی اٹھے
سخنور گئے اور نمودی اٹھے ۲۴

جنھیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے بچھا دیا

جوگراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر ۲۵

جب بے یقینی پیدا ہوتی ہے، اعتبار اٹھ جاتا ہے تو ایسے شکوک وشبہات کی فضا میں ڈر، خوف اور دہشت جیسے عناصر جنم لیتے ہیں۔ ناصر کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ کبھی اسے کوئی دور سے آوازیں دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو کبھی اندھیری رات میں مناظر کچھ کے کچھ نظر آتے ہیں اور اسے خود سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ کبھی ڈراؤنی شکل کی جادوگرنی اسے نظر آتی ہے۔ حتّٰی کہ اس کی نیند بھی خوف اور وسوسوں سے خالی نہیں ہوتی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی ڈراؤنے خواب اسے ستانے لگتے ہیں۔

دیکھ کے دو چلتے سایوں کو
میں تو اچانک سہم گیا تھا
ایک کے دونوں پاؤں غائب تھے
ایک کا پورا ہاتھ کٹا تھا ۲۶

ایک جادوگرنی وہاں دیکھی
اس کی شکل سے ڈر لگتا تھا
ہڈی ہڈی صاف عیاں تھی
پیٹ کمر سے آن ملا تھا ۲۷

آزادی کا سورج اپنے ساتھ بے شمار مسائل لے کر آیا۔ کہیں نئی آبادکاری کا مسئلہ تھا تو کہیں حصول روزگار کا۔ یہ ہجرت، ہجرتِ مدینہ نہ تھی کہ اپنے ملک کے ہم وطن وہم مذہب بھائی ایک دوسرے کے لیے جان ومال کا بٹوارہ برداشت کر لیتے۔ یہاں تو ایک نفسانفسی کا عالم تھا۔ انسانی رشتوں میں خلوص، دردمندی، اپنائیت جیسے جذبوں کا فقدان تھا۔ ناصؔر کا حساس ذہن تخیّل سے حقیقت کا فرق دیکھ کر اداسی اور محرومی میں ڈوبنے لگا۔ انسانی رویوں کی ناہمواری نے شہر والوں سے گلے شکوے بڑھا دئے۔ جبر اور مظالم کے مناظر انھیں بے قرار کرنے کے لیے کافی تھے۔ انھیں خاک نشینوں کے مسائل کا بھی علم تھا اور کج کلاہوں کی حکمتِ عملی کا بھی۔ ناصؔر اس تکلیف دہ صورت حال کا خاتمہ چاہتے تھے۔

شہر خلقِ خدا سے بیگانہ
کارواں میرِ کارواں سے دور ۲۸

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ ۲۹

کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں
چل ساتھی کہیں اور چلیں ۳۰
تمہیں دل گرفتہ نہیں دوستو

ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے ۳۱

کب سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میّتِ شہرِ بے کفن ۳۲

جب انسان بے بس ہو جاتا ہے، اس کے گلے شکوے سننے والے کان بند ہو جاتے ہیں، ہر طرف مایوسی اور نا امیدی نظر آتی ہے تب بھی ایک در کھلا ہوتا ہے جو سب کی فریاد سنتا ہے اور انسان اسی پروردگار کے آگے فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناصؔر کو جب زمیں و آسمان اپنے مخالف نظر آنے لگے تو اس کے لبوں پر فریاد آ گئی۔

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا ۳۳

مسلمانوں کی غربت اور ظلم و ستم سے بھرپور معاشرے کی تصویریں ان کی آنکھوں میں تھیں۔ وہ اپنے وطن کے غریبوں کی حالت زار پر بے انتہا کڑھتے تھے۔ ان کے کرب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سارے زمینداروں کو جب زمینیں واپس ملنے کی امید ہوئی تو ناصؔر نے کہا ''اگر سب لوگ اپنی زمینیں کاشت کاروں کو دے دیں تو میں بھی خوشی سے ایسا کروں گا۔ بھائی آپ کو پتہ ہے یہ کسان اور مزدور میرے قبیلے کے لوگ ہیں''۔۳۴ وہ کہتے ہیں

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں ۳۵

کڑوے خواب غریبوں کے
میٹھی نیند امیروں کی ۳۶

جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دیا ۳۷

ناصؔر کاظمی کو انبالہ کی طرح شہرِ لاہور سے بھی ہمیشہ انس رہا، انھوں نے اس شہر کے سناٹوں سے دوستی کی، درختوں اور چڑیوں سے دوستی کی، اس کی سڑکیں اور اس کی گلیاں اس کی یادیں بنیں۔ جب ناصؔر نے اس شہر کے روشن ستاروں کو ٹوٹتے دیکھا تو وہ خود ٹوٹ کر رہ گیا۔

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی
ٹھنڈی تھی جن کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

بازار بند راستے سنسان بے چراغ ۳۸

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو ۳۹

ناصؔر کاظمی نے اپنے اشعار میں لاہور کا نوحہ بیان کیا ہے، جب لاہور کی ٹھنڈی سڑک، مال روڈ سے اشجار کو بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ ناصؔر کو چونکہ درخت، پودوں، پھولوں سے عشق تھا اس لیے ان سے درختوں کا اجڑنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

پتّیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتلِ گل عام رہا ہے اب کے ۴۰

۱۹۶۵ میں پاکستان کو ایک نئی جنگ کا سامنا تھا لیکن یہ جنگ کچھ حاصل کرنے کی جنگ نہ تھی بلکہ حاصل کردہ دولت کو بچانے کی جنگ تھی۔ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ہزاروں جیالے سرحد پر اپنا فرض نبھانے کے لیے تلوار کی جنگ لڑ رہے تھے تو اندرون ملک ادیب اپنے قلم کے ذریعے اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اس موقع پر دیگر شعراء کی طرح ناصؔر نے بھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ اس سترہ روزہ جنگ میں انھوں نے سترہ ترانے لکھ ڈالے۔ ۴۱ ناصؔر نے ان ترانوں کے ذریعے اپنے ملک و قوم سے محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا۔

پاک فوج کے جواں تو ہے عزم کا نشاں
تیری ایک ضرب سے کوہسار کٹ گئے
دشمنوں کے مورچے ہٹ گئے الٹ گئے
زلزلے پلٹ گئے ۴۲

پاک فوج ہے تیری محافظ ایک وار بس اور دکھا دے
اٹھ اور نام علی کا لے کر دشمن کو مٹی میں ملا دے ۴۳

جنگ کے بعد اعزازات اور انعامات پانے والے، تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لوگوں کو ایک طویل فہرست کا اعلان ہوا لیکن ناصر کا نام اس میں کہیں نہ تھا۔ بحیثیت شاعر ناصؔر کی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر کبھی نہیں کیا گیا، نہ تو ان کی زندگی میں اور نہ ہی ان کی وفات کے بعد۔ ۴۴

ناصؔر نے زمانے کی بے حسی اور بے قدری کے المیے کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔

میں ہوں ایک شاعرِ بے نوا مجھے کون چاہے گا مرے سوا
میں امیر شام و عجم نہیں میں کبیر کوفہ و رے نہیں ۴۵
گل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ

گل چیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے　۴۶

بے حسی اور بے قدری کا المیہ ناصؔر کے اندر تلخی اور غصے کا موجب بنتا گیا۔ انھیں یہ احساس ستانے لگا کہ زر پرست نظام ان کی شاعری اور شاعرانہ طرز زندگی کے درپے ہے۔ یہ احساس ان کے کلام میں غصے کی کیفیت بھر دیتا ہے۔

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغبان یہ کنجِ چمن مجھ سے چھین لے
سینچیں ہیں دل کے خون سے میں نے کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے　۴۷

انھیں اپنے فن کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اس یقین نے ان کے اندر ایک احساس تفاخر پیدا کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو اس وقت سے ڈرانے لگے جب ان جیسا فنکار اس دنیا میں نہیں ہوگا نہ ہی ایسا فن پارہ انھیں دیکھنے کو ملے گا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد زمانہ ان جیسا شاعر اور ان کے کلام کو یاد کر کے ترسے گا۔

زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسے گا
انھیں کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا　۴۸

''تنہائی'' ہمیشہ سے شاعروں اور ادیبوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہ المیہ موضوع ہونے کی وجہ سے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے۔ احساس تنہائی انیسویں صدی کے شعراء کی طرح بیسویں صدی کے بھی اکثر شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ناصؔر جیسے حساس شاعر نے تنہائی کو بہت گہرائی سے محسوس کیا ہے۔

اوپچھلی رات کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں　۴۹
تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور　۵۰

ناصؔر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کا وہی پرانا روگ　۵۱

ناصؔر نے اس تنہائی میں خود کو ڈوب کر فنا ہونے سے بچائے رکھا۔ اس تنہائی کو انھوں نے اپنے لیے محفل بنالی۔ یہ ہی تنہائی کبھی کبھی ان کے دل کی جنّت بن جایا کرتی تھی۔

وہ جنّت میرے دل میں چھپی تھی

میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی میرے دل کی جنّت
میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں　۵۲

البتہ تنہائی نے جس اداسی کو جنم دیا اس اداسی نے ناصؔر کے کلام کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ان کی یہ اداسی اشعار میں ڈھلنے لگی اور سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔ ناصؔر اپنے گرد و نواح کے ماحول میں اداس ہوتا اور شاعری کے ذریعے یہ اداسی لوگوں کے دلوں میں اتار دیتا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے　۵۳

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے　۵۴

رات تنہائی کا بھی سمبل ہے اور تاریکی اور اداسی کا بھی۔ ناصؔر کے کلام میں تنہا بیٹھ کر آنسو بہانا، تاریکی میں جاگنا اور اداسی کے ماحول میں غالباً اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرنا تنہائی کے رجحان کی علامتیں ہیں۔

بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلے پہر
شہر والوں سے چھپ کر پچھلی پہر
چاند میں　بیٹھ کر غزل کہنا ۵۵

ناصؔر کے رتجگے اس کی اداسی کے غماز تھے۔ عقیل روبی کہتے ہیں

''رات ہوتے ہی ناصر کاظمی گم صم ہو جاتے اور ایسے حالات میں تنہائی کے علاوہ انہیں کوئی ہم سفر نہیں بھاتا تھا''۔ ۵۶

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

عشق غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ مختلف شعراء نے عشق کو مختلف زاویے سے دکھایا ہے۔ ناصؔر کاظمی نے بھی اپنی غزلوں میں عشقیہ مضامین باندھے ہیں لیکن دوسرے شعراء سے ہٹ کر۔ ان کے عشق کی رنگینیوں میں غم کی آمیزش ہوتی ہے۔ وہ محبوب کی پرستش بھی کرتے ہیں لیکن اس کے نام سے انھیں کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ اضطربِ عشق ہی زندگی کی سب سے بڑی راحت ہے۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب

ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی　۵۷

عشق میں محبوب سے جدائی یا شبِ فراق جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے۔ عاشق کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک کوئی بات نہیں ہوتی کہ اس نے جس سے محبت کی وہی اس کا دامن جھٹک کر نئے ہم سفر کے ساتھ نیا راستہ اپنا لیتا ہے۔ یہی کیفیت ناصر کے کلام میں نظر آتی ہے۔

اک اجڑے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا　۵۸

ناصؔر نے محبوب کو نہیں بلکہ محبوب نے ناصؔر کو چھوڑ دیا تھا۔ ناصؔر نے تو اسے ہمیشہ اپنی یادوں کی حویلی میں بسائے رکھا۔ ناصؔر کی ذاتی زندگی کا بھی یہ المیہ رہا کہ وہ جسے چاہتا تھا وہ کسی اور کا ہو گیا ۔۵۹

تیرے ساتھ تیرے ہمراہی
میرے ساتھ میرا رستہ تھا　۶۰

اور جب محبوب ہی ساتھ چھوڑ جائے تو بننا سنورنا کیا معنی رکھتا ہے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے　۶۱

لیکن کیا کیا جائے جب کسی کی یاد دل میں بے قراری بھر دے۔ یہ بے قراری ان کے دل کو روز نئی واردات سے دوچار کرتی۔ ویرانوں میں سلگتے رہنا، بھاری رات کا نہ کٹنا، بستی والوں سے چھپ کر پچھلی پہر رونا، دل کانپ کانپ اٹھنا، تنہا تنہا پھرنا محبوب کی یاد کے تلازمات ہیں۔

پھر اس کی یاد میں دل بیقرار ہے ناصؔر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی　۶۲

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی　۶۳

یاد کے بے نشان جزیروں سے
تیری یاد آ رہی ہے ابھی　۶۴

ناصؔر تصورِ جاناں میں ڈوب کر بھی غمِ دوراں کو فراموش نہ کر سکے۔ خارجی حالات کا ان پر اتنا اثر تھا کہ عشق میں رنگینیوں کے خیالات کے ساتھ ساتھ انھیں غم کا خیال بھی آتا ہے۔ اداس رہنے میں بھی ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ زمانے کا غم انھیں گھیرے رہتا ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف معاملات و مسائل کو اس سے الگ کر کے نہیں رکھ سکتے، اس لیے ان کے یہاں عشقیہ واردات کے ساتھ زمانے کے غم کا شدید احساس ملتا ہے۔ اپنے اشعار میں کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ طور پر وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ۶۵

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں
رشتہء جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں ۶۶

پھر شامِ وصالِ یار آئی
بھلا غم روزگار کچھ دیر۔ ۶۷

ناصؔر پر زمانے کے غم کا اتنا شدید اثر رہا ہے کہ وہ خالص رومانی باتیں کرتے ہوئے بھی اس طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ناصؔر نے چونکہ خود پر آشوب زمانہ دیکھا تھا، اس کی تمازت کو محسوس کیا تھا اس لیے ان کے کلام میں دکھوں کے بیان میں بڑی شدت نظر آتی ہے۔ یوں ناصؔر اس نئی نسل کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں جو عشق کی رنگینیوں سے زیادہ زمانے کے غموں سے دوچار تھا۔

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دئے
تجھے بھی نیند آ گئی مجھے بھی صبر آ گیا ۶۸

ناصؔر کاظمی کا شعری سفر ایک تہذیبی آشوب سے شروع ہو کر دوسرے تمدنی المیے پر ختم ہوتا ہے۔ جس طرح صبح آزادی لہولہو تھی اسی طرح شامِ سقوط مشرقی پاکستان بھی خون آشام تھی۔ یہ سقوط اپنے اندر ۱۹۴۷ء کے واقعات سے زیادہ کرب رکھتا تھا کہ بہ وقت آزادی تمام تر دکھوں کے باوجود یہ امر باعث راحت تھا کہ ہم خود مختار ہو گئے لیکن اس شام تو وجود کے آدھے ہونے کا المیہ جنم لے رہا تھا۔ اس عظیم المیے کا دکھ بھی ناصؔر کاظمی نے بڑی عمدہ تمثالوں میں اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مشرقی پاکستان کا لینڈ اسکیپ اپنے تمام تر ثقافتی حوالوں کے ساتھ پینٹ کیا ہے۔ دریا، ساحل، کشتیاں، کھیت، ماہی گیروں کے گیت اور ٹھنڈی راتوں کی تمثالیں جہاں مشرقی پاکستان کی سرزمین کی تصویریں سامنے لاتی ہیں وہیں اس آشوب کے گہرے احساس کی آئینہ دار بھی ہیں جس نے آدھے وجود کے مستقل کرب کو جنم دیا۔ اس حوالے سے ناصؔر نے بعض مکمل غزلوں میں اس کی تمثال کاری سے دل کا درد بیان کیا ہے۔ ۶۹

جنت ماہی گیروں کی　　ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر　　پھواریں سرخ لکیروں کی
اس بستی سے آتی ہیں　　آوازیں زنجیروں کی
دیس سبز جھیلوں کا　　یہ سفر ہے میلوں کا
راہ میں جزیروں کی　　سلسلہ ہے ٹیلوں کا
کشتیوں کی لاشوں پر　　جمگھٹا ہے ٹیلوں کا ۷۰

عمر کے آخری حصے میں ناصؔر کا شعور پختہ ہو چلا تھا۔ ان کے کلام میں جہاں ان کے ذاتی دکھوں کی کہانیاں، ماضی کی دردناک یادیں، پرانی بستی اجڑنے کی داستان، نئی بستیوں کے مسائل، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور غمِ جاناں کی دردناک کہانیاں ملتی ہیں وہیں عمر رفتہ کے گزرنے کی صدا بھی سنائی دیتی ہے۔

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی ۱؎

یہی وہ وقت ہوتا ہے جب گزری ہوئی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کیا جائے۔ زندگی سے کیا کھویا کیا پایا اس کا محاسبہ کیا جائے۔ زندگی کو جبر کی طرح گزارنے والے ناصؔر کہتے ہیں

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی ناصؔر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی ۲؎
سائے کی طرح میرے ساتھ رہے رنج و الم
گردش وقت راس نہ آئی مجھ کو ۳؎

تمام عمر ہم نے یونہی دکھ اٹھایا ہے
زیادہ خرچ کیا اور کم کمایا ہے ۴؎

اردو شاعری میں یاس، دکھ، اجتمائی کرب جب اپنی انتہا پر پختہ فکری سے ہم کنار ہوتا ہے تو اکثر ایسا ہوا اور یہ فطری امر بھی ہے کہ زندگی کی ناپائیداری اور موت کی حقیقت کی آہٹ جیسے دہلیز پر سنائی دینے لگتی ہے۔ زندگی اور موت کی اصل حقیقت جب ناصؔر کے دل و دماغ پر منکشف ہوگئی تو اس نے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ میری بزم میں آ غور سے سن ۵؎

موت سے پہلے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھنے والے شاعر نے آخر موت کو گلے لگا لیا لیکن جاتے جاتے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ یقین دلا گیا کہ

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا ۶؎

دنیا تو سدا رہے گی ناصؔر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر ۷؎

فروری ۱۹۷۲ کو ناصؔر نے بستر مرگ پر دو اشعار ایسے کہے جس کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناصؔر کو بہت پہلے سے علم ہو چکا تھا کہ اب وہ ہجر کے رات کا ستارہ ہے، جسے بہت جلد ٹوٹ جانا ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں اپنی موت کی خبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق اور سننے کا اشتیاق تھا۔ ۸؎ اس لیے انھوں نے موت سے پہلے موت کی کہانی بیان کی

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس وہ ہم سخن ہمارا

سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ ۷۹

۲ مارچ ۱۹۷۲ کو وہ اداس شاعر ناصرؔ حقیقتاً سب کو افسردہ چھوڑ کر ملک عدم کو روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے بارے جو کچھ کہہ گیا وہ کچھ یوں تھا

کہیں کہیں روشنی ہے　　جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے
کہاں ہے وہ اجنبی مسافر　　کہاں گیا وہ اداس شاعر ۸۰

حواشی

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''جدید تر غزل'' مشمولہ'' فنون'' جدید غزل نمبر، جلد نمبر ۸، لاہور، جنوری ۱۹۶۹، ص ۶۵
۲۔ سجاد باقر رضوی ''ناصر کاظمی ایک جائزہ'' مشمولہ ''فنون'' لاہور، جون، جولائی ۱۹۷۲، ص ۴۰
۳۔ ڈاکٹر حسن رضوی ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر، ناصر کاظمی شخصیت اور فن'' سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۶، ص ۸۲
۴۔ ناصر کاظمی ''دیوان'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' جہانگیر بکس، لاہور، ص ۱۷
۵۔ غالب احمد ''ناصر کاظمی کا شہر غزل'' مشمولہ ''اسلوب'' جلد ۸ شمارہ ۱، کراچی، جولائی، ۱۹۸۵، ص ۳۱۰
۶۔ ناصر کاظمی ''برگ نے'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص ۱۴۵
۷۔ ''نشاط خواب''، ص ۲۶
۸۔ ایضاً ص ۲۶
۹۔ ''دیوان'' ص ۹۲
۱۰۔ ''برگ نے'' ص ۱۶۶
۱۱۔ ''نشاط خواب''، ص ۳۰
۱۲۔ ''برگ نے''، ص ۵۹
۱۳۔ ''نشاط خواب''، ص ۱۷
۱۴۔ ''پہلی بارش''، ص ۱۰۳
۱۵۔ ایضاً ص ۱۴۷
۱۶۔ ''برگ نے''، ص ۱۷
۱۷۔ ''دیوان''، ص ۱۱۳
۱۸۔ ''برگ نے''، ص ۵۱
۱۹۔ ''دیوان''، ص ۱۱۱

۲۰۔ ایضاً ص ۳۷
۲۱۔ ''نشاط خواب''، ص ۲۴
۲۲۔ ڈاکٹر حسن رضوی ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' ، ص ۲۴۴
۲۳۔ ناصر کاظمی ''برگ نے'' ، ص ۱۳۶
۲۴۔ ''نشاط خواب''، ص ۲۹
۲۵۔ ''دیوان''، ص ۹۲
۲۶۔ ''پہلی بارش''، ص ۸۱
۲۷۔ ایضاً ص ۲۸
۲۸۔ ''برگ نے''، ص ۱۲۷
۲۹۔ ایضاً ص
۳۰۔ ناصر کاظمی ''دیوان''، ص ۱۱۲
۳۱۔ ''برگ نے'' ، ص ۴۲
۳۲۔ ''دیوان''، ص ۱۱۷
۳۳۔ ''برگ نے''، ص ۲۹
۳۴۔ باصر سلطان کاظمی ''ناصر کاظمی، فن اور شخصیت'' اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ ص ۵۴
۳۵۔ ناصر کاظمی ''دیوان'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص ۵۷
۳۶۔ ایضاً ص ۱۳۵
۳۷۔ ناصر کاظمی ''برگ نے''، مشمولہ ''کلیات ناصر''، ص ۲۹
۳۸۔ ''دیوان''، ص ۳۸
۳۹۔ ایضاً ص ۷۹
۴۰۔ ناصر کاظمی ''دیوان''، ص ۴۱
۴۱۔ باصر سلطان کاظمی ''ناصر کاظمی فن اور شخصیت''، ص ۵۷
۴۲۔ ناصر کاظمی ''نشاط خواب'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص ۱۲۵
۴۳۔ ایضاً ص ۴۵
۴۴۔ باصر سلطان کاظمی ''ناصر کاظمی فن اور شخصیت''، ص ۴۷
۴۵۔ ناصر کاظمی ''دیوان''، مشمولہ ''کلیات ناصر''، ص ۴۷
۴۶۔ ایضاً ص ۱۴
۴۷۔ ایضاً ص ۱۴

۴۸۔ ایضاً ص ۱۴۷
۴۹۔ ایضاً ص ۳۰
۵۰۔ ناصر کاظمی ''برگ نے''، مشمولہ ''کلیات ناصر''، ص ۴۱
۵۱۔ ایضاً ص ۵۹
۵۲۔ ناصر کاظمی ''پہلی بارش''، مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص ۱۱۶
۵۳۔ ''برگ نے''، ص ۱۲۱
۵۴۔ ''دیوان''، ص ۱۶
۵۵۔ ''برگ نے''، ص ۱۵۱
۵۶۔ ڈاکٹر حسن رضوی ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' ص ۵۷
۵۷۔ ناصر کاظمی ''برگ نے'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص ۵۷
۵۸۔ ''پہلی بارش''، ص ۱۰۷
۵۹۔ ڈاکٹر حسن رضوی ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' ص ۲۷۳
۶۰۔ ناصر کاظمی ''پہلی بارش''، ص ۱۱۰
۶۱۔ ''دیوان''، ص ۱۰۴
۶۲۔ ''برگ نے''، ص ۶۲
۶۳۔ ایضاً ص ۷۰
۶۴۔ ناصر کاظمی ''دیوان''۔۔۔۔ص ۳۶
۶۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''ناصر کاظمی اور برگ نے'' مشمولہ ''جدید شاعری'' ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳، ص ۴۰۹
۶۶۔ ناصر کاظمی ''برگ نے'' مشمولہ ''کلیات ناصر''، ص ۶۹
۶۷۔ ایضاً ص ۷۷
۶۸۔ ۔۔۔''دیوان''، ص ۱۱۱
۶۹۔ طارق ہاشمی ''اردو غزل نئی تشکیل'' نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸، ص ۱۰۸
۷۰۔ ناصر کاظمی ''دیوان''، مشمولہ ''کلیات ناصر''، ص ۱۲۳
۷۱۔ ''برگ نے''، ص ۱۵۶
۷۲۔ ''دیوان''، ص ۱۱۸
۷۳۔ ''برگ نے''، ص ۷۸
۷۴۔ ''دیوان''، ص ۱۵۷
۷۵۔ ''برگ نے''، ص ۱۰۹

۷۶۔ ایضاً ص۱۳۸
۷۷۔ ایضاً ص۷۵
۷۸۔ ڈاکٹر حسن رضوی ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر'' ص۲۴۸
۷۹۔ ناصر کاظمی ''دیوان'' مشمولہ ''کلیات ناصر'' ص۱۴۵
۸۰۔ ایضاً ص۱۶۰

Abstract

In past partition era, Nasir Kazmi had a unique identify in modern Urdu "Ghazal". Since He was not associated with any movement hence he had his own ideas in terms of poetry. Nasir Kazmi had harmonized his external problem with his internal discontent which he portrayed in his poetry. His verses depicts the combine experience of migration, atrocities of the colonial forces, in justice of the rules, the pain of uncertainty, the torture of the fall of Dhaka and the twinge of loneliness with full intensity. Hence the poetry of Nasir Kazmi is a combination of both internal and external bitterness.